شعری پیرایے میں تقابلی طریقِ کار:

ڈاکٹر محمد جلال الدین
اسسٹنٹ پروفیسر (اردو)
بی۔این۔کالج، پٹنہ یونیورسٹی

تقابلی تنقید میں بالعلوم دو یا دو سے زائد شاعروں، ادیبوں یا ادبی فن پاروں کو آمنے سامنے رکھ کر تحلیل و تجزیہ اور تقابل کے ذریعہ ان کے مابین مشترک و متخالف عناصر و اوصاف کی نشاندہی کی جاتی ہے اور فنی و فکری سطح پر ان کے مابین تمام ممکنہ اشتراک و افتراقات کو شرح و بسط کے ساتھ دلائل و شواہد کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے، جس سے ان کے درجات کے تعین میں قابلِ لحاظ مدد ملتی ہے۔ اردو میں اوّل اوّل تذکروں، شرحوں یا بعض دوسری ابتدائی تحریروں میں اس کے ابتدائی نقوش یا صورتوں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے، جنہیں بہر حال تقابلی تنقید تو نہیں تاہم اس کی جانب اٹھنے والا ابتدائی قدم قرار دیا جا سکتا ہے۔ اردو میں تقابل یا موازنہ کے ابتدائی نقوش یا روایت کی جب بات چل نکلی ہے تو یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اردو کے کسی شاعر یا ادیب کو مغرب کے کسی شاعر یا ادیب کے روبرو رکھ کر دیکھنے، ان کے مابین نقطۂ اشتراک تلاش کرنے یا ان کے نام سے موسوم کرنے کی ایک قدیم روایت رہی ہے، اور یہ صورتحال آج بھی کسی نہ کسی روپ میں موجود ہے۔ اس ضمن میں یہاں کچھ مثالوں کو پیش کرنا شاید نامناسب نہ ہوگا۔ مجنوں گورکھپوری نے آسیؔ غازی پوری کو اردو کا سقراط کہا ہے(۱) اور اس کا جواز فراہم کرتے ہوئے لکھا ہے:

''موت اور بعد الموت کے متعلق آسیؔ کے علاوہ اگر کسی کو ایسا یقین اور اطمینان نصیب تھا وہ سقراط ہی تھا''(۲)

اس خیال سے اختلاف شاید ممکن نہیں، کیونکہ موت اور بعد الموت کے تعلق سے آسیؔ کے یقین و اعتماد کا اندازہ ان کے اشعار سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں ان کے کلام سے دو شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

اے شبِ گور! وہ بے تابیٔ شب ہائے فراق
آج آرام سے سونا میری تقدیر میں تھا

اب تو پھولے نہ سمائیں گے کفن میں آسیؔ
ہے شبِ گور بھی اس گل سے ملاقات کی رات

یہ اشعار جہاں ایک طرف موت اور بعد الموت پر آسیؔ غازی پوری کے یقین و اعتماد اور طمانیت کو ظاہر کرتے ہیں، وہیں دوسری جانب تاریخ شاہد ہے کہ افلاطون کے استاد سقراط نے تلخ زہر اب کو نوش شیریں پر ترجیح دی، جو اس کی موت اور بعد الموت پر یقین و اعتماد کو ظاہر کرتا ہے۔ یہی وہ مشترک پہلو ہے، جس کی جانب مجنوں گورکھپوری نے اشارہ کیا ہے، اور جو دراصل ان کے مابین موازنہ کی وجہ قرار پائی۔ اردو کے دوسرے ادیبوں کے ہاں بھی اس نوع کی متعدد مثالیں موجود ہیں، جہاں اردو کے کسی شاعر یا ادیب کو مغرب کے کسی شاعر یا ادیب کے روبرو رکھ کر دیکھنے، پرکھنے یا اس کے نام سے موسوم کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ محمد حسین آزاد جن کا شمار اردو کے ممتاز ادیبوں میں ہوتا ہے، ان کے یہاں بھی اس طرح کی مثالیں موجود ہیں۔ ایک مقام پر وہ لکھتے ہیں:

''ولیؔ کو اردو شاعری میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو انگریزی میں چاسرؔ اور فارسی میں رودکیؔ کو حاصل ہے۔''(۳)

ولیؔ دکنی کو اردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے اور انہیں اردو ادب میں وہی مقام حاصل ہے جو انگریزی شاعری کے لئے انگریزی ادب میں چاسرؔ کو حاصل ہے۔ کیونکہ ولیؔ نے اردو شاعری کو فروغ دینے میں اسی طرح کامیابی حاصل کی جس طرح چاسرؔ نے انگریزی شاعری کے

لئے کی تھی۔نورالحسن ہاشمی نے اپنی کتاب ''ولی'' جو پہلی دفعہ ۱۹۸۸ء اور دوسری دفعہ ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئی کے پہلے باب کا آغاز اردو شاعری کو فروغ دینے میں ولی کے کردار اور چاسر سے ان کا موازنہ کئے جانے کی بات سے کیا ہے۔(۴)

اسی طرح عبدالحلیم شرر کو اردو ادب کا والٹر اسکاٹ، آغا حشر کاشمیری کو اردو کا شیکسپیر، اختر شیرانی کو اردو ادب کا کیٹس (Keats) وغیرہ ناموں سے موسوم کرنا اس کی معروف و مروج مثالیں ہیں۔ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا ہے، ''آغا حشر انڈین شیکسپیر تھے تو اختر شیرانی اردو ادب کا کیٹس۔''(۵)

حالی نے بھی اپنی کتاب 'مقدمہ شعر و شاعری' میں سعدی کے کلام پر اظہار خیال کرتے ہوئے سعدی کو فارسی شاعری کا ہومر کہا ہے۔(۶)

یہ چند مثالیں ہیں جن کو اختصار سے پیش کیا گیا، ورنہ اس کی فہرست کافی طویل ہے اور یہ سلسلہ ہنوز قائم و برقرار ہے۔قرۃ العین حیدر کی فکشن نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے بیشتر ناقدوں نے انہیں اردو ادب کی ورجینیا وولف کہا ہے، اور ان کے مابین نقطۂ اشتراک دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔قرۃ العین حیدر کو ان کے انتقال پر خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے سید شاہ سلطان محمد عارف لکھتے ہیں:

''اردو ادب کی ورجینیا وولف کہی جانے والی شخصیت قرۃ العین حیدر نہیں رہیں۔وہ اردو ادب بلکہ ہندوستانی ادب کی آخری Legend تھیں۔''(۷)

اُردو کے معروف تنقید نگار پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے بھی قرۃ العین حیدر کو ورجینیا وولف کے نام سے موسوم کیا ہے۔(۸) اور ان کے ناولوں خاص طور سے ''آگ کا دریا'' پر برطانوی ناول نگار ورجینیا وولف کے ناولوں کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔سچائی یہ ہے کہ تاثیر و تاثر یا اخذ و استفادے کا عمل ادب میں مسلسل جاری رہتا ہے، جو درحقیقت تقابلی مطالعات کے ضمن میں بے حد اہم ہے۔ پروفیسر محمد حسن لکھتے ہیں:

''ادیب ایک دوسرے کی تحریروں سے اثر قبول کرتے ہیں اور یہ اثرات کہیں مشترک موضوعات کی شکل میں، کہیں مشترک علامتوں کی شکل میں اور کہیں مختلف تمثال یا اسلوب کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔یہ اثرات غیر شعوری ہوں تو انہیں ادبی روایات کے ضمن میں رکھا جاسکتا ہے، اگر شعوری ہوں تو انہیں ادبی ممنونیت (Literary Indebtendness) کہا جاتا ہے، جسے تقابلی تنقید نے ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے۔''(۹)

اردو میں ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں، جن میں متذکرہ اوصاف و عوامل یا نقاطِ اشتراک کی بنیاد پر متعلقہ شاعروں یا ادیبوں کے مابین موازنہ کیا جاتا رہا ہے، یا کسی مغربی شاعر یا ادیب کے نام سے اردو کے کسی شاعر یا ادیب کو براہِ راست یا بالواسطہ طور پر موسوم کیا جاتا رہا ہے۔یہ روایت اردو میں بہت قدیم ہے اور کسی نہ کسی شکل میں آج بھی قائم و برقرار ہے۔اس نوع کے رجحانات و رویے ادبی نقطۂ نظر سے کتنے اہم اور سودمند ہیں، ایک الگ موضوعِ بحث ہے، تاہم انھیں تقابل یا موازنہ کی ابتدائی صورت یا بنیاد گزار قرار دینا شاید نامناسب نہ ہوگا، جو تقابلی مطالعات کے ضمن میں خاصے کی چیز ہے۔

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں عرض کیا گیا ہے، تقابل یا موازنہ کی مختلف صورتیں مروج ہیں۔انہیں میں سے ایک نسبتاً قدیم اور معروف شکل ''شعری پیرایے میں تقابلی طریقِ کار'' ہے۔اردو کے شعری سرمایے پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ زیادہ تر شعراء نے اپنے کلام میں تقابلی طریقِ کار اختیار کیا ہے، اور بالعموم دو یا دو سے زائد شعرا کے کلام، افکار و نظریات یا ان کے مقام و مرتبے کا باہم موازنہ کیا ہے۔شعراء کے کلام میں تنقیدی خیالات کی نشاندہی تو متعدد بار ہو چکی ہے، اور اس تعلق سے متعدد ادیبوں اور دانشوروں نے اپنے زریں خیالات کا اظہار کیا ہے۔ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں:

''اردو کے پُرانے شعراء کے کلام میں جستہ جستہ تنقیدی خیالات کا اظہار ملتا ہے۔''(۱۰)

شعراء نے اپنے کلام میں جہاں جگہ جگہ تنقیدی خیالات کا اظہار کیا ہے، وہیں جا بجا تقابل یا موازنہ سے بھی کام لیا ہے۔ اس طریقِ کار سے جہاں ایک طرف متعلقہ شعراء کے مقام و مرتبہ کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں شاعر کی اپنی ترجیحات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ بعض شعراء نے اپنے کلام میں کسی پیش رو یا معاصر شاعر کے ساتھ خود اپنا موازنہ کر کے اپنی انفرادیت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور فکر و خیال کی سطح پر ہم رتبہ قرار دیا ہے۔ اردو کے ایک اہم اور قدیم شاعر ولیؔ دکنی کے کلام سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے ؎

یہ ریختہ ولیؔ کا جا کر اسے سناؤ
رکھتا ہے فکر روشن جو انوریؔ کے مانند
یوں شعر تیرا اے ولیؔ !مشہور ہے آفاق میں
مشہور ہے جیوں کر سخن اس بلبل تبریزؔ (۱۱) کا

متذکرہ اشعار کی روشنی میں یہ اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں کہ ولیؔ نے اپنا موازنہ فارسی کے مشہور شعراء انوریؔ اور تبریزیؔ سے کیا ہے۔ پہلے شعر میں شاعر کا یہ دعویٰ کہ اس کی فکر روشن انوریؔ کے مشابہ ہے، تو دوسرے میں شہرت و مقبولیت کے لحاظ سے خود کو تبریزیؔ کا ہم رتبہ قرار دیا ہے۔ اس نوع کے موازنے ولیؔ کے کلام میں جا بجا پائے جاتے ہیں، اور یہ صرف ولیؔ پر موقوف نہیں بلکہ اردو کے بیشتر شعراء کے کلام میں اس کی نشاندہی ممکن ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

''.....ایک ولیؔ پر منحصر نہیں، اردو کے بہت سے شاعروں نے اپنے اشعار میں اپنے نظریات کا اظہار کیا ہے۔
.....ولیؔ نے بار بار اپنے کلام کو حافظ، انوری، عرفی وغیرہ کے کلام کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔'' (۱۲)

مطالعہ شاعری سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بہت سے شاعروں نے اپنے کلام میں یا تو خود کو کسی شاعر کے ہم مرتبہ قرار دیا ہے یا پھر مختلف شعراء کا، ان کے افکار و خیالات یا مقام و مرتبے کے اعتبار سے باہم موازنہ کیا ہے، اس ضمن میں سب سے پہلے اردو کے ممتاز شاعر علامہ اقبال کے کلام سے کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں، جن کے ہاں تقابل یا موازنہ کا مقصد صرف موازنہ (Comparison) کرنا نہیں ہے بلکہ ایک اہم شعری وسائل کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ انہوں نے مشرق و مغرب کے دو قدآور شعراء اور دانشور غالبؔ اور گوئٹے کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے دونوں کی بلند پائیگی اور ہم پائیگی کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے ؎

آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہم نواخوابیدہ ہے

یہاں اقبال نے جرمنی کے مشہور شاعر اور مفکر، گوئٹےؔ کو غالبؔ کا ہم نوا قرار دیتے ہوئے ان کی یکساں اہمیت و انفرادیت پر اصرار کیا ہے، جس میں موازنہ کا انداز نمایاں ہے۔ اس میں دو رائے نہیں کہ ادبی دنیا میں دونوں کا مقام بہت بلند ہے۔ دونوں اپنی اپنی زبان کے عظیم شاعر ہیں اور اقبال کے خیال کے مطابق انگریزی شاعری میں جو مقام گوئٹے کو حاصل ہے وہی مرتبہ اردو شعر و ادب میں غالبؔ کا ہے، اور غالباً اسی خیال نے اقبال کو دونوں عظیم المرتبت شعراء کے مابین موازنہ پر آمادہ کیا ہے۔ اقبال کے موازنہ اور طریق کار سے اتفاق کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوی لکھتے ہیں:

''بعض انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ مرزا غالبؔ کا شیکسپیر، ورڈزورتھ، ٹینی سن سے مقابلہ کرتے ہیں۔ سچائی یہ ہے کہ غالبؔ کا مرتبہ ان شعراء سے کہیں زیادہ بلند و برتر ہے۔ مرزا غالبؔ کا صحیح اندازہ قائم کرنا خود ایک بلند پایہ شاعر کا کام تھا، اور اقبال نے بجا کہا ہے۔'' (۱۳)

اقبال نے اپنے کلام میں نہ صرف یہ کہ مختلف دانشوروں یا شاعروں کا آپس میں موازنہ کیا ہے، بلکہ مختلف تہذیبوں، زبانوں یا ان کے معاشرتی رویوں کا بھی باہم مطالعہ و موازنہ کیا ہے۔ ان کے اشعار کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے محض مقابلے کی غرض سے

ان کا آپس میں موازنہ نہیں کیا ہے بلکہ کافی غور وفکر اور مطالعہ کے بعد ان کا تقابل کیا ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

''مغربی تہذیب پر اقبال کا تبصرہ کسی محدود نقطہ نظر سے نہیں تھا۔ ان کے سامنے پوری دنیائے انسانیت تھی جس پر وہ ایک آفاقی زاویے سے نگاہ ڈالتے تھے۔ ان کی تنقید عصر حاضر کے عام تہذیبی رجحانات پر تھی، خواہ وہ زمین کے کسی خطے میں رونما ہوں۔'' (۱۴)

درجہ ذیل اشعار کی روشنی میں علامہ اقبال کے افکار یا تقابلی طریقِ کار کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، جن میں بالخصوص مشرق ومغرب کے تہذیبی رویوں اور معاشرتی اقدار کا موازنہ پیش کیا گیا ہے ؎

فساد قلب ونظر ہے فرنگ کی تہذیب — کہ روح اس مدنّیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید — ضمیرِ پاک وخیالِ بلند وذوقِ لطیف
بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق ومغرب کے میخانے — یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا
مجھے وہ درسِ فرنگ آج یاد آتے ہیں — کہاں حضور کی لذت، کہاں حجاب دلیل
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی — جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا
خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ — سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ ونجف
دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دُکاں نہیں ہے — کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا

کلام اقبال میں مشرق ومغرب کے کلچر کا موازنہ اور مغربی تہذیب پر کڑی تنقید جابجا موجود ہے۔ انہوں نے مغربی تہذیب کا بے حد قریب سے مطالعہ کیا تھا اور اپنے کلام میں جہاں جہاں مغربی تہذیب کے حقائق کو اجاگر کیا ہے وہاں تقابل کا انداز بھی نمایاں ہوگیا ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

''اقبالؔ نے اپنے تہذیبی تصور کے ساتھ مسیحی مغرب کے رائج الوقت تہذیبی تصور کا موازنہ کیا ہے تو انہیں اس میں ایسے نقائص نظر آئے جو انسانیت کے مستقبل کے لئے خطرناک تھے۔ ان خطرات کی نشاندہی اقبال نے بار بار طرح طرح سے کی۔'' (۱۵)

پروفیسر سید احتشام احمد ندوی نے بھی کلام اقبال میں تنقیدی وتقابلی پہلو کی نشاندہی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اقبالؔ کے مطالعہ سے یہ بات مترشح ہوگی کہ اقبال نے زندگی کے دائمی حقائق کے علاوہ ان حقائق کو بھی شامل کرلیا ہے جو جدید تہذیب اور یورپی ثقافت سے زندگی میں داخل ہوتے ہیں۔ علامہ اقبالؔ نہ صرف حقائق بیان کرتے ہیں بلکہ ان پر تنقید بھی کرتے ہیں۔ محض بیان حقائق پر وہ اکتفا نہیں کرتے، ساتھ میں وہ اکثر تنقید بھی کرتے ہیں۔'' (۱۶)

علامہ اقبالؔ کے کلام میں جستہ جستہ تفکری وتقابلی پہلو نمایاں ہے، جس کی نشاندہی محولہ بالا اشعار واقوال سے بخوبی ہوجاتی ہے۔ اس نوع کے موازنے نہ صرف یہ کہ اقبال کے ہاں بلکہ دوسرے شعراء کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں، ہرچند کہ ان کے انداز اور طریق ہائے کار جداگانہ ہیں۔ اردو غزل کے معروف شاعر شادؔ عظیم آبادی کے کلام میں بھی اس کی نشاندہی ممکن ہے۔ اپنے ایک شعر میں انہوں نے فارسی کے ممتاز شاعر حافظ شیرازی سے اپنا موازنہ کرتے ہوئے یوں اپنی انفرادیت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ؎

کہتے ہیں شعر کسے؟ بزم پہ کھل جائے گا
شادؔ آیا نہ کہو حافظِ شیراز آیا

اس میں کوئی کلام نہیں کہ دبستانِ عظیم آباد کے منفرد شاعر شادؔ عظیم آبادی اور حافظ شیرازی اپنی اپنی زبان کے استاد شاعر ہیں، اور دونوں

بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔تصوف سے دونوں کا بنیادی شغف ہے،اور یہی وہ مشترک خواص ہیں جو دونوں کو ایک دوسرے سے قریب کرتے ہیں۔اس لحاظ سے دونوں کا آپس میں موازنہ اور پھر شادؔ کا حافظ شیرازیؔ کا ہم رتبہ قرار دینا کچھ ایسا بے جا بھی نہیں۔شادؔ عظیم آبادی کے کلام کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حافظ شیرازی سے خاصے متاثر ہیں،اور جیسا کہ عرض کیا گیا ہے تاثیر وتاثر کا عمل تقابلی مطالعات میں بڑی معنویت کا حامل ہے۔یہی بات شاعری کے تعلق سے بھی کہی جاسکتی ہے،چنانچہ شعری پیرایے میں تقابلی طریقِ کار کے ضمن میں ان پہلوؤں سے روگردانی ممکن نہیں۔اکثر شعرانے اپنے کلام میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اپنے پیش روؤں سے اثرات قبول کرنے کی باتیں کہی ہیں۔میرؔ کے اثرات نہ صرف یہ کہ بعد کے شعرا پر دیکھے جاسکتے ہیں، بلکہ ان کی غیر معمولی فطری صلاحیت کے بھی قائل ہیں۔اردو کے بڑے تنقید نگاروں نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے۔مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں:

''اب تک کوئی شاعر ایسا نہ گزرا جو سادگی، خلوص اور تاثیر میں میرؔ سے آنکھیں ملا سکے۔میرؔ جس مضمون کو لیتے ہیں اس میں ایک انوکھی شان پیدا کردیتے ہیں۔اس بات میں وہ انگریزی کے مشہور جواں مرگ شاعر کیٹسؔ سے بہت قریب ہیں۔''(۱۷)

یوں تو کئی شعراء نے میرؔ کے رنگ میں شعر کہنے کی کوشش کی،لیکن لاکھ سعی وکوشش کے باوجود انہیں یہ اعتراف کرنا پڑا کہ نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب۔ ہر بڑے شاعر کی یہ پہچان ہوتی ہے کہ اس کی شاعری یا رنگِ شاعری کا تتبع آسان نہیں ہوتا۔موازنہ میں رنگِ شاعری کا مطالعہ بہت اہم ہے کیونکہ ہر بڑے شاعر کی انفرادیت بالعموم اسی بات میں مضمر ہوتی ہے۔سید احتشام حسین ندوی لکھتے ہیں:

''دو شاعروں کے درمیان موازنہ کرنے کیلئے لازم ہے کہ ناقد کی نظر ان کے رنگِ شاعری پر بہت گہری ہو۔''(۱۸)

یوں تو ہر صنفِ سخن میں رنگِ شاعری جھلکتا ہے تاہم تغزل میں یہ کیفیت خاص طور سے نمایاں ہوتی ہے۔یہی رنگِ شاعری ہے جو ایک ہی صنف کے دو شاعروں کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے اور دونوں کا موضوع ایک ہونے کے باوجود شاعری کا رنگ اس قدر مختلف ہوتا ہے کہ بادی النظر میں معلوم کیا جاسکتا ہے۔بعض شعرانے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ انہوں نے فلاں شاعر کے رنگ سے خوشہ چینی کی ہے یا ان سے اثر قبول کیا ہے۔ اثر قبول کرنے یا اثر ڈالنے کا یہ سلسلہ شعروادب میں مسلسل جاری رہتا ہے،اور اس کے مثبت نتائج بھی برآمد ہوئے ہیں اور تقابل یا موازنہ کی ضمن میں اہمیت کا حامل ہے۔یہاں کچھ مثالوں کو پیش کرنا شاید نامناسب نہ ہوگا،جن کی روشنی میں شعراء کے کلام میں تاثیر وتاثر یا رنگ موازنہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

شیرینیٔ نسیمؔ ہے، سوز وگدازِ میرؔ — حسرت تیرے سخن پہ ہے لطف سخن تمام — حسرتؔ
غالبؔ ومصحفیؔ و میرؔ ونسیمؔ ومومنؔ — طبع حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض — حسرتؔ
حالیؔ سخن میں شیفتہؔ سے مستفیض ہوں — شاگرد میرزاؔ کا مقلد ہوں میرؔ کا — حالیؔ
شبہہ ناسخؔ نہیں کچھ میرؔ کی استادی میں — آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں — ناسخؔ
غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں — غالبؔ
ہمیں یہ دیکھ کے کہتے ہیں آج کل والے — وہ آگئے روشِ میرؔ کی غزل والے — کلیم عاجزؔ

میرؔ کی شعری عظمت کا نہ صرف یہ کہ بیشتر شعراء قائل ہیں بلکہ ان کے رنگ کلام کو اختیار کرنے کی کوشش بھی کی۔اس عمل میں وہ کہاں تک کامیاب ہوسکے ہیں یہ ایک الگ موضوع بحث ہے۔لیکن اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ میرؔ سے موازنہ کا ایک سلسلہ قائم ہوگیا۔شمس الرحمن فاروقی نے ''خدائے سخن میر کہ غالب'' کے عنوان سے ایک بسیط مقالہ لکھ کر دونوں کے کلام کا ایک بھرپور موازنہ پیش کیا ہے۔ غالبؔ ایک ایسا شاعر ہے، جس کے آگے کسی کا چراغ نہ جل سکا،تاہم میرؔ کے کلام کے مطالعہ کے بعد انہیں یہ اعتراف کرنا پڑا کہ۔

ریختے کے تمہی استاد نہیں ہو غالبؔ! کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا۔

مذکورہ اشعار کے مطالعہ سے نہ صرف یہ کہ بڑے شعراء کے کلام کا بعد کے شعراء پر مرتب ہونے والے اثرات کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ان کے مابین تقابل یا موازنہ کی بھی نشاندہی ہوتی ہے۔ اردو کے شعری سرمایے پر نظر ڈالنے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس نوع کے اشعار کی ایک طویل فہرست ہے۔ یہاں ان سب کا ذکر ممکن نہیں، تاہم بعض نمائندہ شعراء کے کلام کا ذکر بے محل نہ ہوگا، جن کی روشنی میں شعری پیرایے میں تقابلی طریق کار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ہوں ظہوریؔ کے مقابل میں خفائی غالبؔ — میرے وعدے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں غالبؔ
انوریؔ ، سعدیؔ وخاقانیؔ ومداح تیرا — رتبۂ شعروسخن میں ہیں بہم چاروں ایک سوداؔ
طرزِ مومنؔ میں مرحبا حسرت — تیری رنگیں نگاریاں نہ گئیں حسرتؔ
کلام یاسؔ سے دنیا میں پھر اک آگ لگی — یہ کون؟ حضرتِ آتشؔ کا ہم زباں نکلا یاسؔ یگانہ
شیرینیٔ نسیم ہے، سوز وگدازِ میر — حسرت تیرے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام حسرتؔ

ایسے بے شمار اشعار ہیں جن میں موازنہ کا انداز نمایاں ہے، اور بعض نمائندہ شعراء کے کلام کے تناظر میں اپنی انفرادیت ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان مثالوں کو اگر براہ راست تقابل یا موازنہ کی صف میں نہ بھی رکھا جائے پھر بھی انہیں موازنہ کا ایک رنگ قرار دینے میں شاید کوئی تامل نہ ہوگا۔ اس طرح کے خیالات خواہ وہ نظم کے پیرائے میں ہو یا غزل کے، تقابلی مطالعات کے ضمن میں ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں ایجاز دجامعیت اور معنوی دبازت شاعری کا بنیادی وصف ہے اور انہیں اوصاف وعوامل کی وجہ سے کسی شعر کا پھیلاؤ کئی صفحات کو محیط ہوتا ہے۔ ایسے میں جب کسی شعر میں تقابلی اسلوب اختیار کیا گیا ہو، وہ تقابلی مطالعات کے ضمن میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے اور اسے کسی طور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ، یہ رویہ نہ صرف غزل کے اشعار تک محدود ہے بلکہ بعض شاعروں کی پوری پوری نظمیں تقابلی فضا سے معمور ہیں۔ اس ضمن میں حالیؔ کی نظم ''مرثیۂ غالبؔ'' اور اقبالؔ کی نظم ''داغؔ'' کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ ان نظموں میں غالبؔ اور داغؔ کا موازنہ اردو اور فارسی کے بعض دوسرے نکتہ شناس شاعروں سے کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ''مرثیۂ غالبؔ'' کا ایک بند ملاحظہ فرمائیں:

اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح — اہل انصاف غور فرمائیں
قدسیؔ و صائب و اسیرؔ و کلیمؔ — لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے — ہے ادب شرط ،منھ نہ کھلوائیں
غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

یہاں یہ بات غور کرنے کی ہے کہ عصر حاضر میں بھی یہ رویہ خاصا مقبول ہے اور بہت سے معاصر شعرا نے اس جانب بطور خاص انہماک ظاہر کیا ہے اور اپنے نظریات کی ترسیل کے لئے نظم کے پیرایے میں رنگِ موازنہ اختیار کیا ہے۔ حامدی کاشمیری نے لکھا ہے : عصر حاضر میں کئی شعراء نے تخلیق فن پر نظمیں بھی لکھی ہیں۔(۱۹) اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں تنقیدی شعور کے بغیر تخلیقی کارگزاری ممکن نہیں، ایک شاعر کی تنقیدی بصیرت کافی پختہ ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے اس کے افکار وخیالات خواہ وہ شعری پیرایے میں ہوں، اہمیت کے حامل ہیں۔ بہت سارے معاصر شعراء خواہ وہ مشرق کے ہوں یا مغرب کے اپنے تنقیدی خیالات کی ترسیل کے لئے شعری اسلوب اختیار کیا ہے،

اوراپنے تخلیقی ذہن، اس کے محرکات اور تجربے کی لسانی صورت گری کے رموز کی تنقیدی توجیہہ کرنے کے ساتھ ساتھ حسب ضرورت موازنہ کو بھی بروئے کار لانے کی بار آور کوشش کی ہے۔ چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس نوع کے مطالعات یعنی شعراء کے مابین موازنہ کے اس شعری طریقِ کار پر بھی مختلف زاویے سے روشنی ڈالی جائے اور ادب وتنقید میں اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کو واضح کیا جائے۔ جہاں تک اس کی عملی ضرورت واہمیت کا سوال ہے، اس کے بارے میں عجلت میں نظریاتی بنیادوں پر کوئی رائے قائم کرنا خلط مبحث کا باعث بن سکتا ہے۔ یہ کام غیر مشروط ذہن اور گہرے غور وتامل ہی سے انجام دیا جاسکتا ہے۔

حواشی

۱۔	غزل سرا	مجنوں گورکھپوری	ص: ۱۶۳
۲۔	ایضاً		
۳۔	آبِ حیات	محمد حسین آزاد	ص: ۱۱۷
۴۔	تنقیدی دبستان	ڈاکٹر سلیم اختر	ص: ۷۷
۵۔	مقدمہ شعروشاعری	الطاف حسین حالی	ص: ۱۴۵
۶۔	روزنامہ قومی تنظیم، پٹنہ	جمعرات ۴ر فروری ۲۰۲۱	
۷۔	ماہنامہ کتاب نما، ستمبر ۲۰۰۷ء شمارہ ۹ر جلد ۳۷		ص: ۲۱
۸۔	ایضاً		
۹۔	مشرق ومغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ	محمد حسن	ص: ۳۹۶
۱۰۔	مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت	ابوالکلام قاسمی	ص: ۱۴
۱۱۔	مرزا محمد علی صائب تبریزی		
۱۲۔	اردو تنقید کا ارتقا	ڈاکٹر عبادت بریلوی	ص: ۸۳
۱۳۔	محاسنِ کلام غالب	ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری	ص: ۵
۱۴۔	تہذیبوں کا تقابلی مطالعہ: فکرِ اقبال کی روشنی میں	عبدالمغنی	ص: ۷
۱۵۔	ایضاً		ص: ۱۱
۱۶۔	فنِ موازنہ کا ارتقا	سید احتشام احمد ندوی	ص: ۱۴۴
۱۷۔	غزل سرا	مجنوں گورکھپوری	ص: ۲۲
۱۸۔	فن موازنہ کا ارتقا	سید احتشام احمد ندوی	ص: ۱۲۳
۱۹۔	معاصر تنقید: ایک نئے تناظر میں	پروفیسر حامدی کاشمیری	ص: ۱۲۴